جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ھیں۔

نام کتاب	**حُجّتِ خدا**
تقاریر	سید العلماء علامہ علی نقیؒ
تالیف	عابد عسکری فاضلِ قم
ترتیب نو	قلب علی سیال
کمپوزنگ	الحمد گرافکس لاہور (فضل عباس سیال)
ناشر	معراج کمپنی لاہور
تاریخ اشاعت	2014ء
طبع	اوّل
قیمت	

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

LG-3 بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔

فون: 0321-4971214/0423-7361214

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

مکرمی ومحترمی ________________ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''معراج کمپنی'' دینی کتب کی اشاعت کے حوالہ سے ایک جانا پہچانا ادارہ ہے۔ادارہ عرصہ دراز سے دینی کتب کی اشاعت میں اپنی خدمات انجام دے رہاہے۔ادارے کا مطمع نظر عوام تک بہتر اور سستے ترین انداز میں کتب کی ترسیل ہے۔اللہ تعالیٰ ادارہ ھذا کواس عظیم کام کی انجام دہی کیلئے بھر پور وسائل عطا فرمائے۔

زیرِ نظر کتاب ''**حُجّتِ خدا**'' سید العلماء علامہ علی نقیؒ کی دو مجالس پر مشتمل تقریری مجموعہ ہے۔ خالقِ کائنات کا اصل مقصد جو ہے وہ حجت خدا سے وابستہ ہے وہ حجت خدا کبھی نبوت کبھی رسالت کبھی امامت کے نام سے تمام ہوتی ہے۔ نبی کا جانشین اگر نبوت میں ہوتا تو نبی ہوتا رسولؐ کا جانشین اگر رسالت میں ہوتا تو رسولؐ ہوتا مگر چونکہ نبوت و رسالت کی جگہ ختم ہو گئی لہٰذا اب کوئی جانشین نہیں رکھا جائے گا۔مگر امامت کا منصب وہ قیامت تک رہنے والا ہے لہٰذا جو جانشین ہوگا وہ امام کہلائے گا۔قارئین حضرات اس سے بھر پور استفادہ کریں۔

اُمید ہے آپ ادارہ ہذا کی اس کوشش کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور کتابِ ھذا سے بھر پور استفادہ کریں گے اور سید العلماء کی قدردانی کا حق ادا کرنے میں بھی کوشاں رہیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

معراج کمپنی لاہور

فہرست مضامین

مجلسِ اوّل	7
حُجّتِ خدا	8
مصائب	27
مجلسِ دوم	30
حُجّتِ خدا	31
مصائب	52

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ فِیْ کِتَابِ الْمُبِیْنِ وَھُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِیْنَ

موضوعِ آیت

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا
يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ

مجلسِ اوّل

- اصل مقصد جو خالق کا ہے وہ حجت خدا سے وابستہ ہے وہ حجت خدا کبھی نبوت کبھی رسالت کبھی امامت کے نام سے تمام ہوتی ہے۔
- نبی کا جانشین اگر نبوت میں ہوتا تو نبی ہوتا رسولؐ کا جانشین اگر رسالت میں ہوتا تو رسولؐ ہوتا مگر چونکہ نبوت کی جگہ ختم ہوگئی، رسالت کی جگہ ختم ہوگئی لہٰذا اب کوئی جانشین نہیں رکھا جائے گا نبوت ورسالت میں مگر امامت کا منصبِ وہ قیامت تک رہنے والا ہے لہٰذا جو جانشین ہوگا وہ امام کہلائے گا۔
- ایک غریب کے لئے اس کا جھونپڑا اتنا ہی مسرت کا باعث ہوتا ہے جتنا ایک امیر کے لئے اس کا عالیشان محل۔
- واقعہ کربلا کے بعد کوئی ظالم سوچ نہیں سکتا کہ یہ ہوتا تو یہ نہ سہہ سکتے میں کہتا ہوں کہ کیا رہ گیا جو اور کرتے اور کیا باقی رہا جسے یہ نہ سہہ سکتے۔

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید
ایں دو قوت ازحیات آمد پدید

(اقبالؒ)

حُجّتِ خدا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ

(ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں بشارت دینے والے یعنی غیب کی خبریں پہنچانے والے، انذار کرنے والے یعنی عذاب کی خبریں دینے والے تاکہ لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔)

چونکہ موضوعِ بیان میرا اقرار دیا گیا ہے حجتِ خدا، تو اس لئے اس آیت کو میں نے سرنامہ کلام قرار دیا۔ حجت کے معنی لغت میں غلبے کے ہیں، غالب آنا اور دلیل کو حجت کہتے ہیں، اس لئے کہ وہ ذہنی حیثیت سے غالب آنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ یعنی دوسرے آدمی کو اپنے نظریے میں شکست ماننا پڑتی ہے۔ اس لئے دلیل کو حجت کہتے ہیں۔ یہ منطق میں بھی اصطلاح ہے اور عرفِ عام میں عربی کے بھی یہ الفاظ اسی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور اسی لئے دلیل میں جو مقابلہ ہو، اُسے محاجہ کہتے ہیں۔

اب خالق پیغمبروں کے بھیجنے کا سبب یہ بتا رہا ہے کہ ہم نے یہ رسول کیوں بھیجے تا کہ لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے پیش کرنے کیلئے کوئی حجت نہ رہے۔ کیا مطلب؟ یعنی وہ اپنی کوتاہیوں کا، اپنی بداعمالیوں کا خدا کے سامنے یہ عذر نہ پیش کرسکیں ہمارا کوئی رہنما ہی نہ تھا۔ ہمیں کسی نے راستہ ہی نہیں بتایا۔ ہمارے لئے کوئی گمراہی سے بچانے والا نہیں تھا۔ تو اگر ہم نہ بھیجتے مرسلین کو تو خلقِ خدا کی حجت ہمارے مقابلہ میں تمام ہوتی کیونکہ مرسلین کو ہم نے بھیجا تو خلقِ خدا کی حجت تمام نہیں ہوئی۔

یہی نہیں بلکہ ہماری حجت خلقِ خدا پر تمام ہوگئی کہ ہمیں سزا کیوں دی جارہی ہیں؟ اب خالق کی طرف سے اُن کے سامنے یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ ہم نے تمہاری طرف رہنما بھیجے۔ ہم نے تمہاری طرف راستہ بتانے والے بھیجے کہ یہ تم نے عمل نہ کیا تو تم مستوجبِ سزا ہو۔

تو اس کی طرف کے رہنما جو پیغمبر تھے، وہ اس لئے آئے تھے کہ اللہ کی حجت خلق کے مقابلہ میں تمام ہو اور چونکہ وہ شے جو ذریعہ ہوتی ہے، دلیل میں غلبہ حاصل کرنے کا، اُس کو حجت کہتے ہیں، لہٰذا اس ہستی کو جس کی بدولت اللہ کی حجت تمام ہو، حجتِ خدا کہنے لگے۔

مگر یہاں ذرا سوچنے اور سمجھنے کی ایک بات ہے کہ خالق کہہ رہا ہے کہ پیغمبر اس لئے بھیجے کہ اللہ کی حجت تمام ہو۔ یعنی بغیر اس کے بھیجے ہوئے خلق کی حجت اللہ کے مقابلہ میں تمام ہوتی۔ مگر یہ خلق کی حجت کا تمام ہونا جس کو قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر مرسلین نہ بھیجتے تو ان کے پاس حجت ہوتی۔ یہ کس بنیاد پر ہے؟ اگر

عدل کے قائل نہ ہوں؟ عدل کا مطلب یہ ہے کہ خالق ظلم نہیں کرتا۔ عدل کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کوئی نامناسب کام نہیں کرتا۔ تب تو خلق کی حجت اللہ کے مقابلہ میں بغیر مرسلین کے بھیجے ہوئے پوری ہوجائے گی لیکن وہ جماعت جو عدل کی منکر ہے، وہ تو کہتی ہے کہ اللہ قادرِ مطلق ہے۔ جب قادرِ مطلق تو جو چاہے کرے، جو وہ کرے، اس پر کسی کو سوال کا حق نہیں ہے کیوں کیا؟ جو بات وہ کرے، اس کو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ چونکہ اُس نے کی ہے، لہٰذا ٹھیک ہے۔ لہٰذا دنیا میں جو قہر و غلبہ کا اصول ہے، یعنی جس کی لاٹھی، اس کی بھینس۔ وہ لے جا کر الٰہیات میں مطابق کیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ قادر مطلق ہے، اُس کے ہاں یہ سوال ہی کیا ہے کہ یہ صحیح ہے، یہ غیر صحیح۔

اس کی بناء پر خلقِ خدا کیا حجت کرسکتی تھی؟ خلقِ خدا کہے کہ تو نے انبیاء نہیں بھیجے، پھر بھی ہمیں سزا دے رہا ہے؟ وہ جواب میں کہے کہ میں مالک ہوں، جو چاہے کروں۔ میں قادرِ مطلق ہوں، جو چاہے کروں۔ لیکن خالق کہہ رہا ہے کہ اگر انبیاء بھیجتے تو ان کی حجت تمام ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خالق ایسا نہیں ہے کہ جو غلط کام کرے۔ خالق ایسا نہیں ہونا چاہئے جو ظلم کرے۔ یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ وہ بتائے بغیر سزا دے اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہی عدلیہ نہیں ہیں، خالق بھی اُصولِ عدل کا حامل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبروں کو بھیجنے سے جو خالق نے اپنا مقصد بتایا، یہ کیا لفظِ پیغمبر سے تعلق رکھتا ہے؟ حضور! پیغمبر کے لفظ سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق رہنمائی سے ہے۔ لہٰذا جو اس کی طرف سے رہنما ہو، وہ خواہ کسی نام سے ہو، وہ حجتِ خدا ہوگا۔

آدمؑ نبی تھے، تو اپنے دور میں حجتِ خدا تھے۔ جنابِ نوحؑ نبی سے آگے رسول تھے۔ رسالت جنابِ آدمؑ سے نہیں شروع ہوئی، جنابِ نوحؑ سے

شروع ہوئی۔ وہ رسول تھے، اپنے دور میں حجتِ خدا۔ لقب بدل گیا حجتِ خدا ہونا باعتبارِ مقصدِ الٰہی، مشترک رہا۔ آدمؑ جو فقط نبی تھے، وہ بھی حجتِ خدا۔ نوحؑ جو نبی کے ساتھ ساتھ رسول بھی، وہ بھی حجت خدا۔ اس کے بعد جب نقطہ رسالت اور آگے بڑھا اور رسالت کے ساتھ امامت آئی، اب حضرت ابراہیمؑ ہوئے تو وہ بھی حجتِ خدا۔ اب جب رسالت ختم ہوجائے، امام رہ جائے تو وہ بھی حجتِ خدا۔

میں یہاں کہہ دوں کہ وہ جتنے نعرے آپ لگاتے ہیں، وہ آپ ہی لگا رہے ہیں، ان میں خدا شریک نہیں ہے۔ مگر یہ نعرۂ صلوٰۃ جو ہوتا ہے، اس میں اللہ بھی شریک ہوتا ہے۔ تو جنابِ والا! اب نبی، رسول، امام، ان الفاظ کے اختلاف سے نہیں ہوتا۔ اصل مقصد جو خالق کا ہے، وہ حجتِ خدا سے وابستہ ہے۔ وہ حجتِ خدا کبھی نبوت کے نام سے تمام ہوتی ہے، کبھی رسالت کے نام سے تمام ہوتی ہے اور کبھی امامت کے نام سے تمام ہوتی ہے۔

نبوت ختم ہونے والی چیز، رسالت ختم ہونے والی چیز۔ جو لغوی معنی ہیں، وہ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ نبی کے معنی ہیں خبر دینے والا۔ جب تک ایک بھی خبر ایسی رہ گئی ہو، جو نہ دی گئی ہو، اس وقت تک نبی کی ضرورت اور جب سب خبریں پہنچا دی گئی ہوں، تو نبی کی ضرورت ختم ہوگئی۔

رسول کے معنی پیغام پہنچانے والا۔ جب تک ایک بھی پیغام رہے جو نہ پہنچایا گیا ہو، اس وقت تک رسول کی ضرورت اور جب وہ آخری پیغام پہنچا دیا جائے جس کے بعد اللہ کہے کہ دین مکمل ہوگیا تو رسالت کا کام ختم۔ لہٰذا اس کے بعد کوئی رسول نہیں۔ لیکن امامت کے معنی ہیں آگے آگے چلنے والا۔

جب تک راستہ قائم ہے، راستہ چلنے والے موجود ہیں۔ تب تک امام کی بھی ضرورت ہے۔ جب تک جادہ قائم ہے۔ وہ باقی ہے۔ تب تک رہبر کی ضرورت ہے۔ لہٰذا یہ عہدہ ختم نہیں ہوسکتا اور یہی وجہ ہے کہ نبوت ملی تو حضرت ابراہیمؑ نے دستِ سوال نہیں پھیلایا، رسالت ملی تو دستِ سوال نہیں پھیلایا۔ جانتے تھے کہ ایک نقطہ پر ختم ہوجائیں گی۔ جب امامت ملی تو فوراً کہہ دیا:

"وَمِنْ ذُرِّيَّتِي"۔

اب ایک حقیقت کی طرف توجہ دلاؤں کہ نبوت شروع ہوئی حضرت آدمؑ سے۔ رسالت شروع ہوئی حضرت نوحؑ سے۔ امامت شروع ہوئی حضرت ابراہیمؑ سے۔ تو کیا حضرت ابراہیمؑ سے امامت شروع ہوئی اور یہیں ختم ہوگئی؟ شروع جو ہوتا ہے نقطہ، وہاں پر ختم تو نہیں ہوتا اور اب اسی سے آپ منصب کی بلندی دیکھئے کہ نبوت کا آغاز آدمؑ سے ہوا جہاں ترکِ اولیٰ کا امکان ہوا تو ارتقاء ہوتا چلا اور رسالت شروع ہوئی نوحؑ سے۔ وہ آگے بڑھی تو امامت کا استحقاق پیدا ہوا۔ اب امامت شروع ہوئی ہے اس سے جو نبی بھی ہے اور خلیلِ حق بھی ہے۔ اب اس سے امامت شروع ہوئی ہے اور جب امامت دی گئی تو خالق نے کہا کہ امتحان ہم نے لیا:

"فَأَتَمَّهُنَّ"۔

اس کا مکمل جواب طالب علموں کی زبان سے 100/100 نمبر۔ امتحان کے پرچے میں کون ممتحن 100 سے 100 دے دیتا ہے؟ ریاضی

میں دے دیتے ہیں اور کہیں کچھ نہ کچھ ضرور کم کر لیتے ہیں مگر خالق کہہ رہا ہے: ''فَاَتَمَّهُنَّ'' خالق جو کہہ رہا ہے اس میں مبالغہ کا تصور ہے؟ جو نقطہ حقیقت ہے، ''مِثْقَالَ ذَرَّةٍ'' کا جاننے والا۔ ذرہ بھر کمی ہو، وہ تمامیت کی سند کیوں دے گا۔ اب وہ یہ کہہ رہا ہے کہ پورا پورا یعنی ذرہ بھر بھی کم نہیں۔ معلوم ہوا کہ نبوت میں ترکِ اولیٰ کی گنجائش، رسالت تک ترکِ اولیٰ کی گنجائش اور امامت جہاں سے شروع ہوئی، وہاں سے سو فیصد کامیابی، ترکِ اولیٰ کی بھی گنجائش نہیں۔

اب، جو ذات حضرت ابراہیمؑ سے بالاتر ہو اور کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو مگر بہت سے مسلمان بحمد للہ اس ہستی کو جانتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ سے بالاتر ہے اور میں کہتا ہوں کہ وہ اُن کے القاب سے ظاہر ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ، بڑی رفعت ہے، بڑی بلندی ہے۔ اللہ کا دوست۔ دیکھئے اور القاب جتنے ہیں انبیاء کے، ان میں خالق اور مخلوق کا فرق نمایاں ہے، مثلاً حضرت آدم صفی اللہ، یعنی اللہ کے چنے ہوئے۔ وہ چننے والا، ان کی بلندی یہ کہ ان کو اس نے چنا۔ حضرت نوحؑ نجی اللہ، اللہ کے نجات دیئے ہوئے۔ تو وہ نجات دینے والا اور یہ نجات پانے والے۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ، اس سے ہمکلام ہونے والا۔ تو ظاہر ہے کہ ان کا شرف یہ کہ اُس سے ہمکلام ہو رہے ہیں۔ لیکن خلیل اللہ، خلیل اللہ کے معنی اللہ کے دوست۔

یاد رکھئے کہ دوست کا رشتہ برابر کا ہے۔ یہ اُس کا دوست ہی ہے۔ تو

اب بندے کی اس سے بڑھ کر بلندی کیا ہو گی کہ اللہ مقامِ لفظ میں سہی مگر اسے اپنے برابر کی سطح دے دے۔ یہ اس کا دوست، وہ اس کا دوست تو اب یہ رفعت حضرت ابراہیمؑ کی نمایاں ہے۔ مگر حضرت ابراہیمؑ سے بالاتر ذات وہ حبیب اللہ۔ کوئی کہے کیا ہوا، درجہ تو اونچا تو نہیں ہوا۔ لفظ بدل گیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اُردو زبان کی کوتاہی ہے۔ ہمارے ہاں خلیل اللہ کا ترجمہ بھی اللہ کا دوست اور حبیب اللہ کا ترجمہ بھی اللہ کا دوست۔ مگر خلیل میں مضمر ہے طالب ہونا اور حبیب میں مضمر ہے مطلوب ہونا۔ یعنی خلیل وہ ہے جو دوسرے کو چاہے اور حبیب وہ ہے جسے دوسرا چاہے۔

دوست جب ایسے ہوں، ایک ہو طالب، ایک ہو مطلوب تو بڑا فرق ہو جاتا ہے دونوں دوستوں میں۔ برتاؤ میں بھی فرق ہو جاتا ہے اس سے۔ دوستی کے تقاضوں سے کون واقف نہیں۔ کوئی ایسا ہو، آپ اُس سے تعلقات بڑھانا چاہتے ہوں تو اس سے برتاؤ اور ہو گا اور کوئی وہ ہو جو آپ سے محبت بڑھانا چاہتا ہو۔ اس سے برتاؤ اور ہو گا۔ مثال کے طور پر آپ نے ماشاء اللہ کوئی مکان تعمیر کیا ہے۔ ایک غریب کیلئے اس کا جھونپڑا اُتنا ہی مسرت کا باعث ہوتا ہے جتنا ایک امیر کیلئے اس کا عالیشان محل۔ بہرحال حسبِ حیثیت جیسا چاہے، ایک مکان بنوایا۔ کوئی ایسا ملا کہ جس سے آپ محبت بڑھانا چاہتے ہیں تو آپ نے کہا کہ میں نے مکان بنوایا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ آپ بھی دیکھیں۔ یہ آپ نے مکان بنوایا ہے اور دل چاہتا ہے کہ وہ دیکھ لیں اور وہ

کہتے ہیں کہ مجھے فرصت نہیں ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ جس وقت کہیں، میں سواری بھیج دوں گا، سواری پر آ جائیے گا۔ یہ ہوگا برتاؤ اس سے جس سے آپ تعلقاتِ محبت کو بڑھانے کے طلبگار ہوں اور کوئی ایسا ہے جو آپ سے محبت کے تقاضے کو بڑھانا چاہتا ہے۔ خواہ کسی وجہ سے۔ خواہ الیکشن کا موقع قریب آنے والا ہے۔ اس کی بناء پر آپ سے وہ محبت بڑھانا چاہتا ہے۔

تو مکان آپ نے بنوایا ہے۔ اب وہ کہے گا کہ سنا ہے کہ ماشاء اللہ آپ نے ایک مکان تعمیر کروایا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ہم بھی دیکھیں۔ لیجئے !اب اُن کا دل چاہنے لگا اور اب آپ کہتے ہیں کہ میں تو مکان پر کم رہتا ہوں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ جس وقت کہئے، اُس وقت حاضر ہوجاؤں گا۔ آپ نے بددلی سے کہہ دیا اچھا صاحب! فلاں وقت آجائیے گا۔ اب وہ آئے تو جیسے آپ بھول گئے۔ کہا: کیسے آئے؟ کہنے لگے: آپ کا مکان دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے مکان کھول دیا۔ فرض کیجئے، کئی طبقے ہیں اور انہوں نے اِدھر اُدھر سے دیکھا۔ آپ نے کہا: بس دیکھ لیا آپ نے؟ تشریف لے چلئے۔ یہ وہ دوست ہے، جو طلبگار ہے اور وہ پہلا دوست جو مطلوب تھا۔ آپ نے کہا تھا وقت پر سواری بھیجدوں گا۔ اب وقتِ معین پر سواری موجود، نمائندہ موجود۔ وہ ہیں کہ جیسے سوئے ہوئے ہیں۔ کوئی طالب ہو تو بھلا سوتا ہوگا؟ ٹہلتا ہوگا، کروٹیں بدلتا ہوگا۔ مگر وہاں آرام کی نیند ہے۔ اب جگایا جاتا ہے۔ کہا:

کیوں اور کیسے؟ کہا بلایا ہے، سواری بھیجی ہے۔ کہا: اچھا صاحب! سواری بھیج دی ہے تو خیر چلتے ہیں۔

اب چلتے ہیں تو بہت سے طبقے ہیں۔ یہ ہر منزل پر رُکے جاتے ہیں۔ وہاں کہا جاتا ہے، بڑھئے، اور بڑھئے، اور بڑھئے۔ آزادی کے ساتھ صاف الفاظ میں عرض کر دی، اس لئے کہ آپس میں بات کا ذکر تھا کہ میرا دوست ہے، آپ کا دوست ہے، کوئی طلبگار ہے، کوئی مطلوب ہے۔ لیکن اب خالق اور انبیاء و مرسلین کی منازل میں مَیں کچھ اپنی جانب سے عرض کر دوں گا۔ وہ کسی کی کیا مجال لیکن میں کیا کروں، جب قرآن برتاؤ بتا رہا ہے دونوں دوستوں کے ساتھ۔ وہ دوست کہ جو طلبگار ہے، طالب ہے، وہ قرآن کہہ رہا ہے، اس کی روداد سنئے کہ عرض کر رہے ہیں بارگاہِ الٰہی میں:

"اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی"۔

''پروردگار! مجھے دکھلا کہ تو مُردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے''۔

یاد رکھئے کہ گر ہم تصور بھی کریں کہ ایمانِ حضرت ابراہیمؑ میں ذرہ برابر خامی تھی تو کفر ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ غور کیجئے۔ الفاظ ابراہیمؑ کب کسی بے اطمینانی کی یا شک کی خبر دے رہے ہیں؟ یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے دکھلا کہ مردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے؟ کیفیت اسی شے کی پوچھی جاتی ہے جس کا وقوع مانا ہوا ہو۔ یہ نہیں کہتے کہ دکھلا کہ زندہ کرتا ہے بھی یا نہیں۔ کہتے ہیں کہ کیونکر زندہ

کرتا ہے؟ معلوم ہوا کہ زندہ کرنا تسلیم۔

میں مانتا ہوں کہ تو زندہ کرتا ہے، مگر دیکھنا مقصود ہے کہ کیونکر زندہ کرتا ہے اور تمنا کیا ہے؟ مطلق ''اَرِنی'' نہیں کہا ہے جس کے معنی اللہ کا دیدار ہے۔ اس لئے کسی طور کو یہاں سرمہ نہیں بنانا ہے۔ مجھے دکھلا کہ مردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے۔ پس ایک لفظ تو یہیں سے یاد رکھئے۔ ایک آیت الٰہی کے دیکھنے کی تمنا ہے۔ آیت کے معنی ہیں نشانیِ قدرت۔ تو مردوں کو زندہ کرنا کیا ہے؟ اللہ کے کرشمہ قدرت کا ایک ظہور ہے۔ تو ایک آیتِ الٰہی کے دیکھنے کی تمنا ہے۔ یہ خالق سے کہہ رہے ہیں کہ مجھے دکھا کہ مُردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے اور اِدھر سے فرمائش کی تکمیل ہوگی۔ مگر بیچ میں سوال کرلیا جاتا ہے:

''قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ''۔

معنی سمجھ میں نہیں آئیں گے اگر دوستی کے رشتے کو نکال دیجئے بیچ میں سے۔ میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ادھر انہوں نے یہ فرمائش کی اور اُدھر محبوب نے تبسم زیرلب کے ساتھ کہا: کیا ایمان میں کوئی کسر ہے ابھی؟ لیجئے! اب یہ عبودیت ہے کہ ایمان میں کمی کے تصور سے لرزہ براندام ہوجاتے ہیں۔ گھبرا کر کہتے ہیں: ''بَلٰی''، کیوں نہیں۔ یعنی ایمان کیوں نہیں ہے، ایمان تو ہے ہی۔ اب جو ترجمہ میں کروں، اُس کے نتیجہ کا میں ذمہ دار ہوں۔ ''بَلٰی''، کیوں نہیں، ایمان تو یقینی ہے۔

''وَلٰكِنۡ لِّيَطۡمَٮِٕنَّ قَلۡبِىۡ''۔

''لیکن کیا کروں، دل بیقرار کو قرار آجائے''۔

بس مشاہدے کو دل چاہتا ہے کہ تیرا ایک کارنامہ دیکھوں آنکھ سے۔ تو وہ مشکل تو تھا نہیں قدرتِ الٰہی کیلئے۔ کوئی ناروا التجا نہ تھی۔ میں تو کہتا ہوں کہ شائد مجمع میں شاعر بھی ہوں گے۔ شاعروں کے کلام پر نظر بھی ہوگی کہ یہ تو صرف دوستی کے تقاضے کے بیچ میں ایک سخن گسترانہ گفتگو ہوگئی تھی اور ذرا آتش اشتیاق کو تیز کردیا گیا۔ اب خلیل کی فرمائش کی تعمیل ہوتی ہے۔ دوست کی التجا کو یوں پورا کیا جاتا ہے، وہ کیونکر:

''قَالَ فَخُذۡ اَرۡبَعَةً مِّنَ الطَّيۡرِ فَصُرۡهُنَّ اِلَيۡكَ ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنۡهُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ ادۡعُهُنَّ يَاۡتِيۡنَكَ سَعۡيًا ؕ وَاعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۶۰﴾''

''ارے دیکھنا چاہتے ہو مردے کیونکر زندہ ہوتے ہیں تو مشکل کیا ہے، چار طائر لے لو، ان کے ٹکڑے کردو۔ ان کو مختلف پہاڑوں پر رکھ دو۔ پھر پکارنا، وہ سب تمہاری آواز پر آجائیں گے۔ پس سمجھ لو کہ ہم بھی مردوں کو یونہی زندہ کردیتے ہیں۔ جاؤ جواب ہو گیا، سمجھ لو کہ اللہ قادر ہے اور حکیم ہے۔''

لیجئے! یہ ہے اس خلیل سے دوست کے ساتھ برتاؤ جو طالب ہے اور اب جو حبیب ہے، اس کے ساتھ برتاؤ:

مخاطب کیا گیا ہے۔ اب ان کے بعد کوئی نہیں مخاطب ہوگا۔ مگر یہ ہیں نبی اور رسول بلکہ اس کے ساتھ امام بھی ہیں۔

اب مختلف حالات میں کچھ ہنگامی جگہیں، کچھ ہنگامی پوسٹیں مقرر ہوتی ہیں، مثلاً خدانخواستہ اگر جنگ ہوجائے تو زمانۂ جنگ میں کچھ خاص ایسے محکمے قائم ہوجاتے ہیں جو عام حالات میں نہیں ہوتے۔ یا ہمارے ہاں ایمرجنسی لاگو ہوئی تھی، وہاں کی زبان میں بات کررہا ہوں، ایمرجنسی لاگو ہوئی تھی تو اس موقعہ کے اوپر بہت سے ظاہر ہے کہ محکمے ایسے بھی تھے جو اب ایمرجنسی ختم ہونے کے بعد نہیں رہے۔ کیوں نہیں رہے؟ اس لئے کہ کام ختم ہوگیا۔ جب کام ختم ہوگیا تو اب کوئی جانشین نہیں رکھا جائے گا۔

ارے پوسٹ ہی نہیں رہی تو جانشین کا کیا سوال؟ آپ کے ہاں فوجی حکومت ہے تو فوجی حکومت کے تقاضوں سے کچھ محکمے ہوں گے جو شاید جمہوریت قائم ہونے کے بعد باقی نہ رہیں۔ کیوں قائم نہ رہے؟ کیا اس لئے کہ آدمی اس لائق نہیں رہے؟ نہیں، آدمی وہی ہیں جو اس وقت تھے لیکن کام ختم ہوگیا۔ اس لئے وہاں پوسٹ پر کوئی نہیں ہوگا۔ بس یونہی نبی، میں نے کہا کہ کام ہے ختم ہونے والا۔ جب تک ایک خبر بھی باقی ہے، نبی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا نبی کا عہدہ ختم ہوگیا تو نبوت میں کوئی جانشین نہیں ہوگا اور جانشین

نبوت میں ہوتا تو نبی ہی کہلاتا۔ اس لئے کہ جب صاحب جائیں تو ایک دن کیلئے بھی اُس کرسی پر کوئی نائب بیٹھے تو وہ صاحب ہی کہلائے گا۔

وائس چانسلر جائیں اور پرووائس چانسلر قائم مقام کے طور پر کام کریں تو اب ان کو پرووائس چانسلر نہیں کیا کہا جائے گا، پرووائس چانسلر لکھنا ان کی توہین ہوگا۔ تو جو قائم مقام ہو، اُس کا لقب وہی ہوگا جو اس کا ہے جس کا وہ قائم مقام ہے۔ تو نبی کا جانشین اگر نبوت میں ہوتا تو نبی ہوتا۔ رسالت کی جگہ ختم ہوگئی، لہٰذا اب کوئی جانشین نہیں رکھا جائے گا نبوت میں۔ کوئی جانشین نہیں رکھا جائے گا۔ رسالت میں مگر وہ امامت کا منصب تاقیامت رہنے والا ہے۔ لہٰذا اب جو جانشین ہوگا، وہ امام کہلائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ موضوع جو رکھا گیا ہے، حجتِ خدا، وہ لفظ میں نے کہا کہ آدمؑ سے لے کر ہر ایک پر منطبق ہے مگر ذہن میں موضوع رکھنے والوں کے وہ اپنا دور ہوگا، لہٰذا میں سلسلہ بیان کو قاعدے کے مطابق اس نقطے تک لے گیا، امامت کی منزل تک۔ اب اس کے بعد بحمد للہ ایک منزل اور ہے۔ لہٰذا وہ اصل مقصد جو ہے، وہ کل آپ کے سامنے پیش ہوگا۔ یہیں چونکہ مجلس ہے، تقریر تو ہے نہیں کہ اتنی بات پر ختم ہوجائے تو جناب میرے لئے کوئی فضائل سے مصائب کی منزل دور نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ سب دست وگریباں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نبوت سے بالاتر رسالت اور رسالت سے بالاتر امامت۔ نبوت میں ہمارے سامنے قرآن کی نظیر ہے کہ گہوارے کا بچہ کہتا ہے:

"اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ

نَبِيًّا"۔

میں اللہ کا بندہ ہوں، حضرت عیسیٰؑ کی آواز گہوارے سے، میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے اُس نے کتاب دی ہے اور مجھے اُس نے نبی بنایا ہے۔ بنائے گا نہیں، ماضی، مجھے اُس نے نبی بنایا ہے۔ تو حضور! اگر گہوارے کا بچہ کہے کہ مجھے نبی بنایا ہے تو اب سمجھ لیجئے کہ اللہ کے بنائے ہوئے عہدوں میں عمر کی قید نہیں ہوتی۔ اب اگر چار یا پانچ برس کے بچوں کیلئے رسولؐ فرمادیں۔

"اِبْنَایَ هٰذَانِ اِمَامَانِ قَامَا اَوْ قَعَدَا"۔

"یہ میرے دونوں بیٹے امام ہیں، چاہے کھڑے ہوں
اور چاہے بیٹھے ہوں۔"

تو قرآن کے کسی ماننے والے کو تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ چار پانچ برس کے بچے امام کیسے ہوں گے! اب تمام اُمت کی زبان میں بات کروں کہ اگر گزشتہ اُمت میں گہوارے کا بچہ نبی ہوسکتا ہے تو خیرالامم میں چار پانچ برس کے بچے امام کیوں نہیں ہوسکتے؟

تو امام کہنے میں کوئی حیرت نہیں۔ مگر اس وقت میں یہ حدیث سنتا تو ایک جملے کی معنی میری سمجھ میں نہ آتے، بات ختم ہوجاتی ہے کہ میرے دونوں بچے امام ہیں۔ جملہ مکمل ہوگیا۔ یہ اس میں کیا اضافہ کہ چاہے کھڑے ہوں، یہ انسان کے حالات ہیں، کبھی کھڑا ہوتا ہے، کبھی بیٹھتا ہے، کبھی جاگتا ہے، کبھی سوتا ہے، اس کو امامت میں کیا دخل؟ مگر جب مستقبل نے پردہ ہٹایا، ماضی بن

گیا تو میری اب سمجھ میں آتا ہے کہ رسولؐ نے جب فرمایا تو اللہ کے دیئے ہوئے علم سے ماضی کے نقشے میں مستقبل کا نقشہ نظر آرہا تھا۔ آپؐ دیکھ رہے تھے کہ میرے ان دونوں بچوں کا طرزِ عمل ظاہری نگاہوں میں مختلف ہوگا۔ ایک صلح کرکے بیٹھ جائے گا، ایک تلوار لے کر کھڑا ہوجائے گا۔ کچھ لوگ اس کی صلح پر معترض ہوں گے، کچھ لوگ اس کی جنگ پر معترض ہونگے۔ اس لئے رسولؐ نے فرمادیا کہ میرے دونوں بیٹے امام ہیں، چاہے کھڑے ہوں، چاہے بیٹھے ہوں، یعنی حسنؑ صلح کرکے بیٹھ جائے تو اعتراض نہ کرنا، حسینؑ تلوار لے کر کھڑا ہوجائے تو اعتراض نہ کرنا۔ تو اُٹھنا بھی خدا کے حکم سے ہے، یہ بیٹھنا بھی خدا کے حکم سے ہے۔ وہ بھی امامت کا ایک انداز ہے، یہ بھی امامت کا ایک شیوہ ہے۔

پروپیگنڈے سے دنیا واقف ہے۔ حکومت کا ایک پروپیگنڈہ تھا، حکومت کا ایک پروپیگنڈہ تھا، بنی اُمیہ کی طرف سے کہ دونوں بھائیوں کے مزاج میں پہلے سے بہت اختلاف تھا۔ وہ بھائی صلح پسند تھے کہ باپ کو بھی جنگِ صفین سے روکتے تھے کہ خونریزی نہ کیجئے اور یہ ایسے جنگ پسند تھے کہ بھائی کی صلح کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ یہ کرتب ہوتے ہیں سیاست کے کہ بھائیوں میں اختلاف دکھایا جائے۔

میں کہتا ہوں کہ ذرا غور کیجئے۔ وہ دنیا جو کہتی ہے کہ امام حسن علیہ السلام صلح پسند تھے اور امام حسین علیہ السلام جنگ پسند تھے تو کیا حضرت امام حسینؑ نے صلح کی

کوشش نہیں کی تھی؟ یہ تو مخالف فریق کا طرزِ عمل ہے کہ اُس نے ان کی شرائط سب مسترد کر دیں۔ وہاں صورتحال یہ ہے کہ اُدھر سے سادہ کاغذ آ گیا تھا کہ جو شرائط چاہیں، لکھ دیں، ہمیں منظور ہیں۔ یہاں شرائط پیش کر رہے اور اُدھر سے مسترد ہو رہی ہیں۔ اب جیسے 2 اور 2 کا مجموعہ 4 ہے، سمجھدار بچے سے میں پوچھتا ہوں کہ اگر شرائط اُدھر سے منظور ہو جاتیں تو کربلا کی تاریخ صلح پر ختم ہوتی یا جنگ پر؟ تو اب کسی کو کیا حق ہے کہ اُن کو شہزادۂ امن کے اور ان کو شہزادۂ جنگ کہا جائے؟

نہیں! دونوں شہزادۂ امن ہیں، فرق کا احساس ہے۔ دونوں شہزادۂ جنگ ہیں۔ وقت کے تقاضے دیکھئے اور دیکھئے کہ رسولؐ نے تو حدیبیہ میں صلح کی تھی۔ اس وقت پورا موضوع نہیں عرض کرنا ہے۔ دی ہوئی شرائط پر کہ جو وہ کہہ رہے تھے، وہ مان رہا تھا اور انہوں نے جو صلح کی ہے، وہ کیسی شاندار! پہلی شرط یہ ہے کہ امیر شام کو کتاب وسنت پر عمل کرنا ہوگا۔ ماشاء اللہ! مجمع میں قانون دان حضرات بھی ہوں گے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ شرط رکھ کر ایک طرف حسنؑ مجتبیٰ نے یہ بات صاف کر دی کہ ہماری نزاع حکومت شام کے خاندانی ہے، نہ قبائل۔ ہماری نزاع اصولی ہے۔ لہٰذا اگر کبھی جنگ بھی ہو جائے تو اسے خاندانی جنگ نہ کہنا۔ دوسری بات یہ کہ حضرت امام حسن علیہ السلام نے یہ شرط رکھی اور گویا اقرار لے لیا کہ ابھی تک جو ہو رہا ہے، وہ کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ اب سینکڑوں وکیل کتابیں

لکھتے رہیں صفائی میں کہ اُن کی خلافت مثلِ خلافتِ راشدہ تھی۔

میں کہتا ہوں کہ انہوں نے خود مان لیا کہ اب تک جو ہو رہا ہے، وہ کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ کوئی کہے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ انہوں نے مانا؟ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ جو شرائط لکھئے، وہ مجھے منظور ہیں اور یہ مانا کہ اس کا ثبوت یہ کہ صلح ہو گئی۔ اگر مانا نہ ہوتا تو صلح نہ ہوتی۔ تو اب انہوں نے تو ایسی شاندار صلح کی اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے سامنے کیا مؤقف تھا؟ حضرت امام حسینؑ کے سامنے یہ مؤقف تھا کہ یزید طالبِ بیعت ہے۔ بیعت اطاعت کا غیر مشروط اقرار ہے۔ تو اب تمام عالم اسلام میں ان کی شخصیت بہت مانی ہوئی ہے۔ لیکن یہاں اس ملک میں تو بہت ہی اہمیت رکھتی ہے شخصیت ڈاکٹر اقبال کی، تو ڈاکٹر اقبال کی زبان میں:

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا میں آئے تو تھے ہجرت کے تین چار سال گزرنے کے بعد۔ لیکن آدمؑ کے وقتِ اول سے لے کر حسینؑ اور یزید کے درمیان جنگ قائم تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کا یہ مطلب ہے کہ اقبال کی زبان میں ہر دور کا حق پرست رمزی طور پر حسین ہے اور ہر دور کا باطل پرست رمزی طور پر یزید ہے۔

تو اب اس اصطلاحِ اقبال کو سامنے رکھ کر جو میں کہہ رہا ہوں، اس پر غور کیجئے کہ میں کہتا ہوں کہ ان سے پہلے کسی دور کے حسینؑ نے کسی یزید کی بیعت

نہیں کی۔موسیٰؑ نے فرعون کا کہامان لیا ہوتا تو جلاوطن کیوں ہوتے۔ابراہیمؑ نے نمرود کا کہامان لیا ہوتا تو آگ میں کیوں پھینکے جاتے اور ہمارے رسولؐ نے ابوجہل اور ابولہب وغیرہ کا کہامان لیا ہوتا تو 13 برس جسم مبارک پر پتھر کیوں کھاتے؟ تو پھر کہوں گا کہ کسی دور کے حسینؑ نے کسی دور کے یزید کی بیعت نہیں کی۔

تو ماشاء اللہ صاحبانِ فہم ہیں۔اب میں یہاں کہتا ہوں کہ آج کا موسیٰ ؑ ،آج کا ابراہیمؑ، آج کا محمد مصطفیٰ ﷺ، اپنے وقت کے فرعون ونمرود وابوجہل کی بیعت کیوں کرے گا؟ تو میں کہتا ہوں کہ امام حسینؑ نے کوئی نیا کام نہیں کیا۔انہوں نے وہی کیا جو اُنؑ کے بزرگ، انؑ کے اسلاف ہمیشہ کرتے آئے تھے۔مگر اس کے ساتھ ایک اور بات کہتا ہوں کہ واقعہ کربلا کی مثال نہ اولین میں ہے اور نہ آخرین میں۔تو کوئی کہے گا کہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ ابھی تو یہ کہا کہ کوئی نیا کام نہیں کیا۔کیا وہی جوان کے اسلاف نے کیا اور اب کہا جارہا ہے کہ اس کی مثال نہ اولین میں ہے، نہ آخرین میں۔

میں کہتا ہوں کہ بالکل میں نے دونوں باتیں سمجھ کر کہی ہیں۔انہوں نے وہی جو ہمیشہ اُنؑ کے آباؤاجداد نے کیا، اسلاف نے کیا تھا مگر ہوا ان کے ساتھ جو، وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔اور اس کو یوں عرض کرتا ہوں کہ ہمیشہ ظلم کے دل میں کچھ حسرت رہ گئی اور صابر کے متعلق کچھ غلط فہمی دنیا کو باقی رہ گئی۔ظلم کے

دل میں حسرت یہ کہ اتنا ہم نے کیا، اتنا اور کرتے تو انہیں راہِ حق سے ہٹا دیتے۔یہ تو ظلم کی حسرت رہ گئی۔صابر کے متعلق یہ غلط فہمی رہ گئی کہ ہم نے اتنا کیا تو برداشت کر گئے، اگر اتنا اور کرتے تو پھر آدمی تھے، بشر تھے، پھر برداشت نہ کر سکتے۔ یہ حجت حسینؑ نے کربلا میں ختم کردی۔اب ظالم سوچ نہیں سکتا کہ ہم یہ کرتے اور صابر کے متعلق غلط فہمی نہیں ہوسکتی کہ یہ ہوتا تو یہ نہ سہہ سکتے۔

مصائب

میں کہتا ہوں کہ کیا رہ گیا جو وہ کرتے اور کیا باقی رہا جسے یہ نہ سہہ سکتے ؟اور بس، یہ بابِ مصائب ہے،عموماً مصائب میں ایسی چیزیں خلافِ اصولِ ذاکری سمجھی جاتی ہیں جس میں ذہن کو ذرا اُلجھا دیا جائے مگر میرا طرز یہی ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ دماغ کو بھی متوجہ رکھئے ، جو حقیقت ہے، اُسے بھی سمجھئے اور پھر دل کو بھی جو اثر کا تقاضا ہے، وہ کیجئے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر جنگ مغلوبہ ہوتی اور سب ایک ساتھ شہید ہوجاتے تو یہ جو ہر اختیارِ صبر نمودار نہ ہوتا۔ اصحاب سب چلے گئے،عزیز ابھی سب ہیں۔ اب بھی حسینؑ اقرارِ بیعت کرکے عباسؑ کی جوانی کو بچا سکتے ہیں، اب بھی حسینؑ اقرارِ بیعت کر کے علیؑ اکبر کے شباب کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔مگر کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے دکھلا دیا کہ نہیں! جس راہ میں حبیب کی پیری گئی تھی، اُسی راہ میں علیؑ اکبر کا شباب بھی جائے گا۔بس چند جملے اور ذرا غور کیجئے ،کیا عرض کررہا ہوں کہ حضور! کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کیلئے بہت آسان تھا کہ صبحِ عاشور میدان میں جاتے اور جنگ کرکے اپنا سر راہِ خدا میں دے دیتے لیکن اگر ایسا کرتے تو اُن کی منزل یحییٰ بن ذکریا علیہ السلام سے آگے نہ بڑھتی ۔ جنابِ یحییٰؑ کا بھی سر قلم ہوگیا تھا۔ یہ بھی اپنا سر قلم کروا لیتے تو اس منزل سے اُن کی منزل آگے نہ بڑھتی ۔کربلا میں حسینؑ کا کارنامہ یہ نہیں کہ سر دے دیا، کارنامہ یہ ہے کہ جب تک ایک بھی رہا، سر نہ دیا۔اب میں اسے

اپنی اردو زبان میں کہہ دوں کہ کربلا میں مرنا اتنا مشکل نہ تھا، جتنا جینا مشکل تھا اور اس لئے پیغمبر خدا کا اصولِ جنگ جو تھا، نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ہمیشہ عزیزوں کو آگے رکھتے تھے، اصحاب کو پیچھے رکھتے تھے، کیا معاذ اللہ حسینؑ اپنے خاندانی اصولِ جنگ کو نہیں جانتے تھے؟ اپنے نانا کی سیرت سے واقف نہ تھے؟

مگر کربلا میں یہ اُلٹ گیا، اصحاب آگے رکھے گئے،عزیز بعد کو رکھے گئے، یہ کیا؟ بات یہ ہے کہ ہر جنگ میں یقین ہوتا تھا کہ کچھ شہید ہوجائیں گے، کچھ بچ جائیں گے۔ وہاں اگر اصحاب کو آگے رکھیں تو اس کے معنی یہ کہ غیروں کو کٹوانا ہے، اپنوں کو بچانا ہے،لیکن کربلا میں یہ تو طے شدہ تھا کہ شہید ہونا سب کو ہے، امکاناتِ حیات تو شبِ عاشور کو خطبے سے ختم کئے جا چکے ہیں، اب تو یہ طے ہے کہ سب جان دیں گے۔لیکن صورتِ واقعہ یہ ہے کہ جو پہلے چلا گیا، اس کی مسافتِ مصیبت مختصر ہوگئی ۔ ارے سب مصیبتیں ایک طرف ، پیاس ہی کو لے لیجئے ، جہاں ساتویں سے پانی بند ہو، آفتاب کی تمازت کے ساتھ،طوفانِ عطش سیلابی رفتار سے بڑھ رہا ہے، اب یہاں جو سب سے پہلے آ گیا، ادھر کا نووارد، وہ ابھی جائے گا کیونکہ جب تشنہ ہوکر آیا تھا، جب تو پانی پلا دیا تھا، اب دوست ہوکے آیا تو ایک گھونٹ پانی کا نہیں کہ مہمان کی ضیافت کرسکیں۔

اگر پانی پلا نہیں سکتے تو پیاسا بھی کیوں رکھیں، کہا جاؤ، اجازت ہے، پہلے جاؤ، آخر خاص الخاص اصحاب، وہ دوپہر تک باقی رہیں۔ حبیب دوپہر تک

ہیں، ابوثمامہ دو پہر تک ہیں اور اصحاب میں سے بھی جب تک ایک ہے، کوئی عزیز نہ جائے۔ ممکن ہے کہ کسی ذاکر سے آپ نے سنا ہو لیکن جہاں تک میر امطالعہ ہے، یہ نہیں ہے کہ عزیزوں نے جانا چاہا ہو، اصحاب نے قدموں پر سر رکھ دیئے ہوں کہ ہم اپنی زندگی میں نہیں جانے دیں گے۔ کربلا کے اقدامات تکلّفات کے ماتحت نہیں ہو رہے تھے، فرائض کے ماتحت ہو رہے تھے۔

میں تو یہ جانتا ہوں کہ حسین نے حکماً روکا، حکماً منع کیا، جب تک اصحاب میں سے ایک بھی ہے، کوئی عزیز، خبردار نہ جائے۔ اے علیؑ اکبر! تمہیں کیا حق ہے کہ کوثر پر جا کر سیراب ہو جاؤ اور حبیب پیاسا رہے؟ ارے قاسمؑ! تم کم سن سہی، تمہیں کیا حق ہے کہ تم اپنی پیاس ختم کردو اور میرے اصحاب تشنہ لب رہیں۔ جب عزیزوں کی باری آئی تو دور کے عزیز پہلے جائیں، فرزندانِ جعفر چلے جائیں، فرزندانِ عقیل چلے جائیں، برابر کا بھائی بعد کیلئے رہے، جوان بیٹا بعد کیلئے رہے، یعنی جس کی قوتِ برداشت کا امتحان زیادہ لینا ہے، اُسے آخر تک کیلئے رکھا ہے۔ بس اس جملے کے بعد ختم کردوں گا مجلس کہ مولا سے خود عرض کروں کہ مولا! یہاں تک میری منطق نے ساتھ دیا، یہاں تک میرے فلسفے نے مدد کی، مگر مولا! میری منطق اور فلسفہ ہتھیار ڈالتا ہے کہ یہ عباسؑ کے بعد، یہ علیؑ اکبر کے بعد، یہ چھ مہینے کی جان، یہ شہزادہ علیؑ اصغر؟ اسے بس مولا نے اپنا پیش خیمہ رکھا۔

مجلسِ دوم

- نبوت و رسالت کے جانشین کے کوئی معنی نہیں ہاں امامت ہے کہ جو برقرار ہے لہٰذا امامت میں جو جانشین ہوگا وہ امام کہلائے گا اور یہ سلسلہ قیامت تک قائم و دائم رہے گا۔
- دریائے محمدؐ و آلِ محمدؐ میں اپنے دین کی کشتی کو ڈال دیجئے پھر جتنا ظرف میں صلاحیت ہوگی مل جائے گا۔
- ارشادِ خداوندی ہے کہ قرآن مجید میں ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کیلئے جو غیب پر ایمان لائیں، یاد رکھیئے غیب پر ایمان لائے بغیر دین کی بنیاد قائم ہی نہیں ہوسکتی۔
- میں کہتا ہوں دنیا اپنے گریباں میں منہ ڈال کر کیوں نہیں دیکھتی گیارہ کے ساتھ کیا کیا جو کہتے ہو بارہواں کیوں غائب ہوا۔
- غیب وہ نہیں ہے جو ہو ہی نہ، غیب وہ نہیں ہے جو آنکھوں کے سامنے ہو غیب ایک ثبوت اور ایک نفی سے مل کر بنتا ہے یعنی ہو اور آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔

حُجّتِ خدا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ

(ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں بشارت دینے والے یعنی غیب کی خبریں پہنچانے والے، انذار کرنے والے یعنی عذاب کی خبریں دینے والے تاکہ لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔)

چھٹے پارے کی آیت ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ پیغمبر ہم نے بھیجے ہیں مبشر اور منذر یعنی خوشخبری دینے والے اور عذاب سے ڈرانے والے تاکہ لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے، اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔ اگر یہ نہ بھیجے جاتے تو لوگوں کو پاس حجت ہوتی۔ اب یہ بھیج دیئے گئے تو اب اللہ کے پاس حجت ہوگئی اور اس لئے ان ہستیوں کو حجتِ خدا کہتے ہیں۔ حجتِ خدا وہ ہے جو خالق کی طرف سے رہبری کیلئے مقرر ہو۔ پہلے اس کا نام نبی ہوا، وہ حجتِ خدا بنام نبی رہا۔ پھر اس کا نام رسول ہوا، حجتِ خدا بنام رسول رہا۔ اس کے بعد

حضرت ابراہیمؑ سے اس کا نام ان کے ساتھ تبدیل ہوا یعنی نبی بھی تھا، رسول بھی تھا اور اب امام ہوا۔

یہیں یہ جز وکل میں نے عرض کیا تھا کہ نبی ہوئے ہیں۔ ایسے جو کسی ایک قوم کے لیے نبی ہیں۔ رسول ہوئے ہیں ایسے جن کی رسالت محدود ہے، کسی ایک دائرے میں، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ السلام کے لیے، حالانکہ وہ اولوالعزم رسول ہیں مگر تحقیق یہ ہے کہ ان کی رسالت صرف بنی اسرائیل کے دائرے میں تھی۔ بنی اسرائیل کے لیے وہ رسول تھے۔ اس دائرے کے باہر ان کی رسالت نہیں تھی اور اسی لئے حضرت خضر ان کے دائرہ رسالت سے باہر تھے۔ ان کی رسالت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ تو نبی جنات کے لئے ہوئے ہیں۔ رسول وہ کسی ایک قسم کے لئے، کسی ایک قبیلہ کے لئے ہوئے ہیں۔ امامت جہاں سے شروع ہوئی تو:

"اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا"۔

"میں تمہیں تمام انسانوں کا امام بناتا ہوں"۔

اب انسان کسی بھی خطہ ارض پر ہوں، کسی بھی زمین پر ہوں بلکہ کسی بھی جہاں میں انسان بستے ہوں تو ان سب کے لئے امام اور جب امامت آگے بڑھ کر خاتم المرسلین تک پہنچی تو اب "للنَاس" کے لفظ میں ارتقاء ہوا۔ وہاں تھا "للنَاس" کیا کہا: "رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ"۔ یہ رحمت ہیں تمام عالمین کے لئے۔ اب یہ عالمین کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ اسے اس سے سمجھ لیجئے کہ اپنی ربوبیت کی حدود جب بتائے تو یہی کہا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"۔

''حمد ہے اللہ کے لئے جو تمام عالمین کا رب ہے''۔

اور ان کو کہا:

"وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾"۔

اس کا مطلب ہے جہاں تک خدا کی خدائی، وہاں تک ان کی بحیثیت رسول رہبری۔ اب حضرت ابراہیمؑ سے تو آغاز ہوا تھا۔ وہاں پر اس نقطے میں امامت ''لِلنَّاس'' تھی تو ان کے براہِ راست جو نائب ہوئے، وہ نائب بھی ''لِلنّاس'' ہوئے، صرف انسانوں کے لئے ہوئے اور جب امامت بڑھ کر للعالمین کے دائرہ تک پہنچ گئی تو اب جو نائب ہوں گے، وہ سب عالمین کے لئے ہوں گے۔

اب میں نے کل عرض کیا، بات یہاں تک پہنچی تھی کہ نبوت ختم ہو جانے والی شے ہے، اس لئے نبوت میں جانشین کوئی نہیں ہوگا۔ رسالت ختم ہو جانے والی چیز ہے، لہٰذا رسالت میں کوئی جانشین نہیں ہوگا۔ اب معلوم نہیں کہ دنیا کس بات میں جانشین کی تلاش میں ہے۔ رسول کا جانشین ڈھوند رہی ہے، نبی کا جانشین ڈھونڈ رہی ہے؟ تو جگہ ختم ہوگئی، کیا اس کا الیکشن ہوتا ہے؟

تو نبوت کی جانشینی کے کوئی معنی نہیں، رسالت کی جانشینی کے کوئی معنی نہیں۔ ہاں! امامت ہے کہ جو برقرار ہے، لہٰذا امامت میں جو جانشین ہوگا، وہ امام کہلائے گا۔ اب تمام مسلمان متفق ہیں کہ ہمارے رسوؐل آئے تو سب کے

بعد۔ لیکن ہر نبی، ہر رسول اپنے دور میں ان کی اطلاع دیتا رہا۔ آدمؑ سے لے کر ہمارے رسولؐ کے قبل تک ہر ایک ادھر کا رہنما آخری رسول کے آنے کی اطلاع دیتا رہا، خبر دیتا رہا اور خبر ہی نہیں دیتا رہا بلکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ اپنی اُمتوں سے عہد و پیمان لیتے رہے کہ اس آخری رسولؐ کو مانو گے۔ اس آخری رسولؐ کو تم تسلیم کرو گے۔ تو یہ ہے کہ ہر نبی اس آخری رسولؐ کی خبر دیتا رہا، تو اب پیغمبرؐ خدا کے بعد وحی کا دروازہ بند ہے۔ لہٰذا جو کچھ اس کے پیغام ہوں، وہ انہیں پہچانا ہیں۔ لہٰذا اب ان کو اپنے بعد تک کا سب کا تعارف کروا دینا چاہیئے کہ میرے بعد کون لوگ ہوں گے۔

اب یہاں علم الغیب کی بحث نہیں آسکتی، اس لئے کہ گزشتہ دور کے انبیاء علم الغیب اگر نہیں رکھتے تھے تو آخری رسولؐ کی خبر کیوں دے رہے تھے؟ تو ان سے افضل جو ذات ہے، وہ اگر قیامت تک کے رہنماؤں کی اطلاع دے دے!

آدمؑ واقف ہو سکتے ہیں محمد مصطفیٰؐ کے نام سے، نوحؑ ان کے نام سے واقف ہو سکتے ہیں، عیسیٰؑ واقف ہو سکتے ہیں۔ قرآن میں موجود ہے:۔

"وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ"۔

انہوں نے کہا بشارت دیتا ہوں ایک ایسے رسول کی جس کا نام احمدؐ ہوگا۔

اسی قرآن میں احمد کے ساتھ غلط کا لفظ نہیں ہے کہ احمدی ہے۔ تو عیسیٰ نام جانتے تھے۔ تو جو فخرِ عیسیٰ ہو، جو حضرت ابراہیمؑ کا فخر ہو، کوئی کہے کہ یہ تو آلِ ابراہیمؑ میں سے ہیں تو ابراہیمؑ کا فخر کس طرح ہو سکتے ہیں؟ میں کہتا ہوں کہ ابراہیمؑ بھی تو اولادِ آدمؑ میں سے ہیں۔ اگر وہ ابراہیمؑ، آدمؑ کی اولاد کا فخر ہو گئے تو یہ آلِ ابراہیمؑ کا فخر ہوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

تو جو اُن سے افضل و برتر ہے، وہ اگر بعد کے افراد کا نام بتا دے، سب کا نام بہ نام تصریح کر دے تو اس میں کسی کو، قرآن کے ماننے والے کو، ارے اپنے رسوؐل کی رسالت کو ماننے والے کو، چونکہ ان کی خبر تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء نے دی تھی، اگر ان سب کو مان لیا تو اگر یہ اپنے بعد والے افراد کے نام بتا دیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ میں کہتا ہوں کہ آدمؑ سے لے کر ان کے پہلے تک کے جتنے تھے، وہ محمدِ اول کا نام بتاتے رہے اور جو پہلا محمد آیا، وہ اپنے آخری ہمنام کی اطلاع دیتا ہوا آیا، اب یہ حدیث، بغیر نام کی گنتی والی تو بالکل متفق علیہ صحاحِ ستہ میں بھی ہے اور غیر صحاحِ ستہ کتنی مستند کتابوں میں بھی ہے کہ پیغمبرؐ خدا نے ارشاد فرمایا کہ میرے بعد بارہ سردار ہوں گے۔ کہیں بارہ سردار، کہیں بارہ جانشین۔ اثناء عشر خلیفہ، میرے بعد بارہ جانشین، یہ بھی الفاظ ہیں۔

ایک عیسائی نے صحاح وسنن کے تمام کی فہرست مرتب کی ہے یورپ میں اس میں اثناء عشر کے لفظ کے تحت اُس نے ان تمام حدیثوں کے حوالے

درج کر دیئے ہیں جس میں کہیں بارہ سردار، کہیں بارہ خلیفہ لکھا ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ کہ حضرتؐ نے اطلاع دی۔ اب اس کے بعد کہیں ہے:

"كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْش"۔

"وہ سب قریش میں سے ہوں گے"۔

اور میری نظر سے گزرا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"كُلُّهُمْ مِنْ وُلْدِ فَاطِمَةُ"۔

" وہ سب فاطمہؑ کی نسل سے تعلق رکھتے ہوں گے"۔

بہرحال وہ بارہ جانشین تو سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں اور اب کوئی زیادہ مطالعہ کرے تو اسے بائبل میں بھی بارہ سردار ملیں گے اولادِ اسماعیل میں سے۔ قرآن کہہ رہا ہے، قرآن نے بتایا ہے کہ بنی اسرائیل میں بارہ اسباط تھے اور ان کی بائبل بتا رہی ہے کہ اسماعیل کی اولاد میں بارہ سردار ہوں گے۔ اب اسماعیل کی اولاد وہ بنی اسرائیل سے الگ ہے۔ وہ تو ہمارے رسولؐ سے شروع ہوئی ہے۔ اسماعیلؑ کی اولاد کے وہ افراد جن سے دنیا متعارف ہے، وہ تو ہمارے رسولؐ سے شروع ہوتے ہیں۔ تو وہاں ہے بارہ سردار، بائبل میں بھی ہے بارہ سردار اس کی اولاد میں سے یعنی اسماعیلؑ کی اولاد میں سے مقرر کروں گا۔

اب ہمارے رسوؐل فرما رہے ہیں کہ بارہ سردار ہوں گے یا بارہ

جانشین میرے ہوں گے۔ جمہور نے جو فہرستیں مقرر کی ہیں یعنی مسلمانوں کی اکثریت، اسے ہم جمہور کہتے ہیں تو اس نے جو فہرستیں مرتب کیں تو ایک حد بندی کی راشدین کی، تو وہ چار سے آگے نہ بڑھے۔ راشد، غیر راشد کو ملا لیا تو درجنوں ہوگئے۔ غرض اکثریت کو بارہ سرداروں کے خواب کی تعبیر نہ ملی۔ بارہ کسی طرح نہیں ہوتے یا چار ہی ہوتے ہیں اور یا بہت ہوجاتے ہیں۔ بارہ تو ایک درجن ہوتا ہے۔ میں نے تو کہا کہ بہت درجن۔ تو اب یہ بارہ کہاں سے ملیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہی ہاتھ سے چلی گئی ہے تو وہ سلسلہ کہاں سے ملے؟

اب بحمد للہ ہم کو معلوم ہے یعنی دنیا کو، اب میں کہتا ہوں کہ احسان ماننا چاہئے اس جماعت کا جو کوئی سے بارہ پیش کر سکے۔ رسولؐ کی سچائی کے ثبوت کے لئے۔

بحمد للہ وہ افراد جنہیں ہم جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں بقدرِ امکان جتنا کہ ایمان لانے کے لیے ضروری ہے، ورنہ دنیا خدا کو کب پہچانتی ہے؟ پھر بھی خدا کو مانتی ہے۔ رسولؐ کو انؐ کے حقیقی مرتبے کے ساتھ کون پہچانتا ہے؟ پھر بھی مانتا ہے تو اگر مکمل پہچاننا شرطِ ایمان ہوتو کوئی خدا پر ہی ایمان نہیں رکھتا، اس لئے کہ مکمل معرفت خدا کی کس کو ہے؟ ہم اور آپ کیا ہیں؟ جس نے ہم کو ایمان کی بھیک دی، وہ کہتا ہوا دنیا سے گیا:

"مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ"۔

"ہم نے تجھے جو معرفت کا حق ہے نہیں پہچانا"

تو حقِ معرفت الگ ہوتا ہے اور معرفت بقدرِ امکان الگ ہوتی ہے۔ اس کو میں کبھی کبھی سیرت کے جلسوں میں، مشترک سیرت کے جلسوں میں، جو بین الاسلامی ہوں، کہا کرتا ہوں کہ پیغمبرؐ خدا کو حقیقی مراتب کے ساتھ پہچاننا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اگر سوئی سمندر کے اندر ڈال دیں تو سمندر سوئی کے ناکے میں سمائے گا نہیں، لیکن بقدرِ ظرف تو یہ لے ہی لے گی۔ ویسے ہی دریائے معرفتِ محمدؐ میں اپنے ذہن کی کشتی کو ڈال دیجئے، پھر جتنا ظرف میں صلاحیت ہوگی، آجائے گا۔ تو اب وہ جملہ، چونکہ وہ لفظ میری زبان سے نکل گئے تھے کہ جنہیں ہم جانتے اور پہچانتے ہیں، یہ "پہچانتے ہیں" بڑی تعلّی کا جملہ تھا، اس لئے مجھے اتنا کہنا پڑا، تو بقدرِ ظرف جتنا جانتے اور پہچانتے ہیں۔ تو ان میں سے حضور گیارہ افراد تو دنیا کی آنکھوں کے سامنے رہے اور بحمد للہ! ہماری ہی کتابوں میں ان کے حالات نہیں ہیں بلکہ دنیا کی کتابوں میں علماء کی کتابوں میں، ہر دور کے، ان کے حالات موجود ہیں اور ان کی محض کتابیں تو مستقل اُن کے حالات میں لکھی گئی ہیں۔

یہ چیزیں دُہرائی جانا چاہئیں۔ اتحاد بین المسلمین کے لئے فائدہ مند ہیں کہ علمائے اہلِ سنت نے جو کتابیں آئمہ اہلِ بیتؑ کے بارے میں لکھی ہیں، ان کے ناموں سے لکھنے والے کا عقیدہ نمایاں ہوتا ہے، جو میرے قریب ہیں، انہی سے شروع کروں۔ یہاں ماشاءاللہ لکھنؤ کے بہت حضرات

ہوں گے۔فرنگی محل سے کون واقف نہیں؟ وہ علماء کا مرکز رہا ہے تو ہمارے فرنگی محل کے قدیم عالم مولانا محمد مبین، جن کی کتاب شرحِ سُلّم منطق کے کورس میں بھی ایک وقت پڑھائی جاتی تھی۔ اب بھی مطالعہ تو ضرور کرتے ہیں جو ذوق مطالعہ رکھتے ہیں، شرح سُلّم مختصر طور پر تو ملا مبین ہی کہلاتی تھی، وہ ملا مبین ہوگئی۔ جیسے ملا حسن، ویسے ملا مبین، تو وہ ملا مبین فرنگی محلی، وہ فارسی زبان میں کتاب لکھتے ہیں جسے منشی نول کشور نے اپنے مجمع میں چھاپ دیا تھا یعنی مطبع بالکل غیر جانبدار ہے۔

وہ کتاب چھپی تھی، وہ اب بھی کتب خانوں میں محفوظ ہے۔اس کا نام دیکھئے، انہی آئمہ کے حالات میں ہیں اور نام اس کا کیا ہے؟ ''وسیلۃ النجات'' ۔نجات کا وسیلہ۔اب دنیا چیخے، یہ نام ہی خود شرک ہے مگر وہ اسے شرک سمجھتے تو یہ نام کیوں رکھتے ''وسیلۃ النجات'' نجات کا وسیلہ۔ یہ حنفی عالم ہیں، ہمارے فرنگی محل کے علماء ہیں۔انہوں نے یہ کتاب لکھی، انہی حضرات کے حالات میں علامہ عبدالقادر شافعی یمن کے عالم، انہوں نے کتاب لکھی ''ذخیرۃ المال فی مناقب الآل''۔اس کا بھی نام مٰال، یعنی انجامِ کار کا ذخیرہ مطلب ہی ہوا جو وسیلۃ النجات کا مطلب تھا۔ وہی اس کا مطلب ہوا کہ مٰال کے لئے انجام دینے کے لئے یہ ذخیرہ ہے۔

مزید سب کتابیں جو ہیں وہ دنیا کے لئے ہیں، یہ آخرت کے لئے ہے۔ جناب کمال الدین محمد ابن طلحہ شافعی کتاب لکھتے ہیں ''مطالب السؤل

فی مناقبِ آل رسولؐ '' اور حافظ محب الدین طبری، حافظ یہ قرآن کے یاد رکھنے والے کا نام نہیں جو زبانی یاد کریں۔ یہ علم حدیث کی اصطلاح تھی کہ جو ایک لاکھ حدیثیں مع متن وسند یاد رکھتا تھا، اس کو حافظ کہتے تھے۔تو یہ حافظ محب الدین علمائے اسلام میں 14 سو برس میں علمائے اہلِ سنت میں آٹھ، دس ہیں صرف، جن کو حافظ کہا جاتا ہے، حافظ ابن حجر، حافظ جلال الدین سیوطی، بس چند آدمی ہیں جو حافظ کہے جاتے ہیں۔تو وہ لکھتے ہیں۔ جناب حافظ محب الدین طبری، ذخائر العقبیٰ فی مناقب ذوی القربیٰ، یعنی عقیدہ بھی ظاہر، آیہ مودت کی تفسیر بھی نام سے ظاہر، ذخائر العقبیٰ، عقبیٰ کے لئے ذخیرہ فی مناقبِ ذوی القربیٰ۔

تو یہ تمام علماء ہر دور میں کتابیں لکھتے رہے تو ان کے حالات میں دیکھ لے جو کوئی، جہاں ضمنی آئے ہیں، وہ اور بے شمار، یہ تو اتنی کتابیں وہ میں نے کہیں جو مستقل اسی میں لکھی گئیں، ورنہ علامہ ابن حجر مکی نے جو کتاب شیعوں کی رد میں لکھی '' صواعق محرقہ''، اس میں بھی ان حضرات کے حالات، صواعق محرقہ میں بھی اور اسی طرح سے اور علماء انہوں نے جو اپنی کتابوں کے درمیان لکھے ہیں، ابن خلکان نے وفایات الاعیان میں حالات لکھے ہیں۔تو جو غرض کر رہا ہوں، وہ یہ کہ جو کوئی کسی ایک کتاب میں، خواہ ان کے حالات میں لکھی گئی ہو، خواہ ضمناً حالات آئے ہوں تو ہر امام کے حالات دیکھئے تو لکھنے والے متفق ہیں کہ ان کے دور میں ان سے بڑھ کر کوئی عابد نہ تھا۔ اپنے دور

میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں تھا۔ اپنے دور میں ان سے زیادہ کوئی زاہد نہیں تھا۔ یعنی جتنی صفات ہوتی ہیں نبوت کی، وہ تمام صفت ہر دور میں ہر امام کے اندر موجود ہیں۔ جتنی صفات ہیں، کمالاتِ رسالت کی، ان میں سے ہر ایک میں کہہ رہے ہیں کہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑے عالم، اپنے زمانہ میں سب سے بڑے زاہد، اپنے زمانہ میں سب سے بڑے متقی، اپنے زمانے میں سب سے بڑے عابد۔ ان تمام صفات پر دنیا متفق ہے گیارہ اماموں تک۔ وہ تو آنکھوں کے سامنے رہے، حالانکہ میں فطرتِ انسانی کو گواہ کرتا ہوں کہ جتنے تاریخ کے عالم ہوں، اسے دیکھ لیجئے کہ ایک نسل میں پانچ درجے تک کمالات یکساں نہیں آتے۔

بیٹا نمایاں ہوا، پوتا اس سے کم ہوا۔ پھر پڑپوتا بڑھ گیا، پھر اس کے بعد کمی ہوگی۔ یہ یکساں کمالات پانچ پشتوں تک نہیں آتے، چہ جائیکہ آنکھوں کے سامنے گیارہ تک۔ رسولؐ کی سچائی ثابت ہوگئی کہ ہر دور کا وہ انسان جو ایک جماعت، جسے امام کہہ رہی ہے، وہ انہی صفات کا حامل ہے جو امام میں ہونا چاہئے۔ ہر ایک ان صفات پر متفق، گیارہ تک آنکھوں کے سامنے۔

بس میں کہتا ہوں کہ گیارہ تک آنکھوں کے سامنے آگئے، اب صرف ایک فرد کے لئے اس سچے کی سچائی کو مشکوک کروگے؟ مگر جتنی منطق اس فلسفے کی مباحث ہیں، وہ سب آخری فرد میں آجائیں گی۔ وہی حقیقت میں موضوع رکھنے والوں کی مراد ہے حجتِ خدا سے۔

سب مباحث وہیں پر آجائیں گی، حالانکہ وہ تو سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ مجھے یہاں نام لے دینا چاہئے، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جس کی جو بات ہو، وہ اس کا حوالہ دے کر بیان کی جائے کہ ایک عالم آئے تھے، نجف اشرف سے 30,25 برس بلکہ زیادہ ہوئے ہوں گے، جب ڈاکٹر اقبال زندہ تھے، وہ شیخ اسد اللہ زنجانی لکھنؤ میں راجہ صاحب محمود آباد کے مہمان ہوئے تھے، اس وقت تک آپ کا پاکستان نہیں بنا تھا، وہ وہیں تھے، قیصر باغ میں ان کے مہمان ہوئے تھے اور وہ یہاں لاہور بھی آئے تھے۔ ان کے عصمتِ انبیاء کے موضوع پر تبادلۂ خیالات ہوئے اور وہ مطمئن ہوئے۔ چنانچہ ان کی کتاب نجف اشرف میں چھپی ہے۔ اس میں اس گفتگو کا حال ہے جو ڈاکٹر اقبال سے ہوئی تھی۔ تو ان کا یہ جملہ ہے کہ یہ ایک مناظرے کا اصول ہے کہ اصل مسئلہ امامت پر تو بحث نہیں کرتے اور آجاتے ہیں بارہویں امام پر کہ صاحب! سمجھا دیجئے ہم کو کہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ ہر چیز کا اصول یہ ہے کہ جو بنیاد ہو اس کی وہاں سے مانئے، خدا کو آپ نہیں مانتے اور رسولؐ پر بحث کیجئے۔ اس کے کوئی معنی نہیں ہیں رسولؐ ہی کا کوئی قائل نہیں ہے، ایمان پر بحث کیجئے تو کوئی معنی نہیں ہیں۔

وہ پورا سلسلہ چھوڑ کر آپ آخری فرد پر بحث کر رہے ہیں۔ تو یہ بحث بے اصول ہے۔ تو جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے مسکرا کر کہا:

''شمیا زدہ را قبول بکنید، دو از دھم از شانمی خواہیم''۔

"آپ ان گیارہ ہی کو مان لیجئے، بارہویں کو معاف کر
دیں گے ہم، نہ مانئے"۔

توحقیقت یہ کہ یہ اصول جب مان لے گا کہ جس کی وجہ سے گیارہ امام ہیں تو وہ لازماً کشاں کشاں مان لے گا اس بارہویں کو۔ مگر پورے سلسلے کو چھوڑ کر جب اس نقطے پر آ کر گفتگو کریں گے تو بات الجھ جائے گی۔

توحضور! گیارہ فرد آنکھوں کے سامنے رہے۔ اب اس فرد کے بارے میں گفتگو ہے، کیوں گفتگو ہے؟ اس لئے کہ غائب ہے، آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ میں کہتا ہوں کہ پورے قرآن کے حافظ نہ بنئے، سورہ بقرہ کو ہی یاد کر لیجئے۔ ارے پوری سورۂ بقرہ بہت مشکل ہے۔ آپ اس کی ابتدائی آیت یاد کر لیجئے۔ کیا کہا جا رہا ہے:۔

" هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝٢ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ "۔

"یہ ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر
ایمان لائیں"۔

کون پرہیزگار؟ پرہیزگار وہ ہوتے ہیں جو غیب پر ایمان لائیں۔ معلوم ہوتا ہے، کتنا ہی افعال واعمال پرہیزگارانہ رکھئے، جب تک غیب پر ایمان نہیں ہوگا، قرآن بھی دامن چھڑا لے گا۔ کوئی منطقی اعتراض نہیں، کوئی عقلی اعتراض نہیں۔ بس یہ کہ آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، کیونکر مانیں؟ میں کہتا ہوں

کہ آپ نے اصولِ دین میں سے کونسی چیز آنکھوں سے دیکھ کر مانی ہے؟

یاد رکھئے! جب تک غیب پر ایمان نہ لائیں، دین کا کوئی ستون قائم نہیں ہوسکتا۔ دین کی بنیاد ہی قائم نہیں ہوسکتی۔ ایمان لایئے، سب سے پہلے اللہ کو مانا، میرے نزدیک تو آنکھ سے دیکھ لیتے تو اللہ ہی نہ ہوتا اور پھر کسی کو خود نہ دیکھا ہو، کسی نے تو دیکھا ہوگا۔ یہاں وہ ذات ہے جس کو کسی اس کی طرف دعوت دینے والے نے دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے دیکھا ہے۔ کسی کو بیداری میں نہ دیکھا ہو خواب میں تو دیکھا ہو مگر اس کو میں کہتا ہوں کہ خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔

ایک عقلی اصول عرض کرتا ہوں کہ خواب میں بھی وہی چیز دیکھی جاسکتی ہے جو بیداری میں بھی دیکھی جاسکے۔ خوشبو خواب میں بھی سونگھی جائے گی، دیکھی نہیں جائے گی۔ آواز خواب میں بھی سنی جائے گی دیکھی نہیں جائے گی۔ نرمی سختی خواب میں بھی چھونے سے معلوم ہوگی، دیکھی نہیں جائے گی۔ نوعیتِ حادثہ نہیں بدلتی، صرف عالمِ حادثہ بدل جاتا ہے۔ سونگھنے کی چیز خواب میں بھی سونگھی ہی جاتی ہے اور سننے کی چیز خواب میں بھی سنی ہی جاتی ہے۔ اور جو نہ سننے کی چیز ہو، نہ دیکھنے کی چیز ہو، وہ خواب میں کیونکر دکھائی دے گا؟

میں کہتا ہوں کہ اگر دیکھا ہو تو کسی اور کو دیکھا ہوگا۔ مجھے معلوم ہیں ایسے دعویدار جنہوں نے دیکھا، کہا کہ ہم نے خواب میں دیکھا۔ خواب میں دیکھنے کے دعویدار مجھے معلوم ہیں۔ کتاب میں مَیں نے پڑھا ہے، وہی ہمارے

اور وہ اب بھی ہمارے ملک کے رہے۔ ہمارے ملک میں جو نبی پیدا ہوئے ،
بٹوارے کے بعد بھی وہ ہماری قسمت میں ہو گئے۔

تو جناب! وہ ہمارے ملکی نبی، ان کی کتاب میں مَیں نے خود پڑھا ہے کہ میں نے اللہ سبحانہ کو خواب میں دیکھا، خواب میں جو دیکھا تو دوات وقلم و کاغذ بھیج دیا۔ خیر اللہ سبحانہ، کے سامنے دوات، قلم بڑھا دیا۔ یہی بہت بڑی بات ہے مگر اپنے مطلب کی بات لکھوانا تھی، اس لئے بڑھا دیا، اگر خطرہ ہوتا کہ ہمارے خلاف لکھیں گے تو کبھی نہ بڑھاتے۔ دوات وقلم آگے بڑھا دیا کہ جو دعویٰ کرنا تھا۔ اس کا پروانہ لکھ دیجئے، نبوت کا پروانہ۔ تحریک کرکے لکھوا رہے ہیں، یہ لکھ دیجئے۔ انہوں نے بلا تکلف قلم اٹھایا۔

اب بیچ بیچ میں تبصرے کے جو الفاظ ہوں گے۔ وہ میرے ہوں گے۔ مضمون ان کا ہے کہ بعض اوقات آپ نے دیکھا ہوگا کہ قلم میں روشنائی زیادہ آجاتی ہے تو کیا کرتے ہیں؟ جھٹکتے ہیں۔ فاؤنٹین پین والے بھی بعض اوقات جھٹکتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ نب کو روشنائی میں ڈبویا تو ایسے بے اٹکل پن سے کہ روشنائی زیادہ آگئی۔ اس کے بعد جھٹکا تو ایسی بدتمیزی سے کہ چھینٹے پڑے۔ آنکھ کھل گئی۔ اب نتیجہ جو ہے وہ میرے الفاظ میں سنئے کہ پروانہ تو نہ تھا، دامن پر دھبے موجود تھے۔ اب وہ کرتہ موجود تھا جس پر نشان ہیں روشنائی کے اور ہر سال وہاں زیارت ہوتی تھی اس کی، اُس ملک میں، اب یہاں پھر ہونے لگی ہوگی جو اس کے پہلے مرکز تھا۔ تو ہر سال زیارت ہوتی

تھی اسے دھبوں کی جو نہیں معلوم کس نے ڈالے ہیں؟

تو حضور! پھر وہ اصل بات یہ ہے کہ میں نے کہا کہ خواب میں عقلاً نا ممکن ہے اسے دیکھنا تو ایسا غیب اور اسے مان رہے ہیں۔ جب تک نہ مانیں مسلمان ہی نہ ہوں گے۔ اس کے بعد لوگ کہیں گے کہ اصل بیچ میں سے چھوڑ دی۔ نہیں، جسے سب مانتے ہیں، اس فہرست کو کہہ رہا ہوں کہ رسولِ خداؐ سے جب آگے بڑھے تو رسالت، تو رسالت کو آنکھ سے دیکھ کر ماننا ہے۔ ارے ہم نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔ جب دیکھا، جس نے دیکھا، واقعی رسالت کو آنکھ دسے دیکھ کر مانا۔ ارے صاحب! سامنے تو چہرہ مبارک ہے، سامنے تو گیسوئے مبارک ہیں، سامنے تو دندانِ مبارک ہیں۔ مشاہدات تو یہ ہیں مگر ایمان کیا اس گیسو پر لانا ہے؟ ایمان اس چہرے پر لانا ہے؟ ایمان اس دندانِ مقدس پر لانا ہے؟ ایمان لانا ہے رسالت پر۔ رسالت کے معنی ہیں بھیجنا۔ جب بھیجنے والے کو نہیں دیکھا تو بھیجنا کہاں دیکھیں گے۔

تو رسالت وہ جزو ایمان ہے۔ وہ غیب کی چیز ہے، جبرئیلؑ امین کو آتے نہیں دیکھا، لوحِ محفوظ سے قرآن کو اُترتے نہیں دیکھا۔ وہ سب غیب کی باتیں ہیں۔ اس کے بعد آخر میں پہنچ جائیے۔ تین مشترک اصل ہیں کہ توحید کے بعد رسالت، رسالت کے بعد قیامت، قیامت کو آنکھ سے دیکھ کر مانا؟ دیکھ لیتے تو قیامت ہو ہی نہ جاتی؟ تو قیامت کو بغیر دیکھے مانا اور قیامت کے ساتھ غیب کا کارخانہ مانا، صراط کو مانا، میزان کو مانا، نامۂ اعمال کو مانا، جنت کو مانا،

دوزخ کو مانا، ایک دنیا مانی غیب کی۔ ہر مسلمان نے مانی۔

اب میں کہتا ہوں کہ جس کے کہنے پر اتنے غیب مان لئے، ایک غیب کی خاطر اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالتے ہو؟ اب اس کے بعد ان کے ارشادات اور قرآن کی آیات لے لیجئے۔ تو یہ حضور قرآن کیا کہہ رہا ہے؟

"کُوْنُوْ مَعَ الصَّادِقِیْنَ"۔

"صادقین کے ساتھ رہو"۔

مکمل صادق سوائے معصوم کے کوئی نہیں ہوسکتا۔ تو کہا جا رہا ہے کہ صادقین کے ساتھ رہو کہ ایک صادق کبھی ہوا تھا، اب تم ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کے اقوال پر عمل کیا کرو۔ تو میں کہتا ہوں کہ صادقین کی کیا ضرورت ہے، ایک صادق تو تھا ہی جسے مشرکین بھی صادق کہتے ہیں۔ تو یہ صادقین کی کیا ضرورت ہے؟ جب اسی رسولؐ کی زبانی کہا گیا کہ صادقین کے ساتھ رہو تو معلوم ہوا کہ اس کے علاوہ ایک سلسلہ ہے جو اسی معیار کے صادقین کا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک وہ افراد باقی ہیں، جن سے کہا جا رہا ہے، وہ پوری اُمتِ مسلمہ ہے، جب تک مسلمان امت کا وجود ہے، تب تک صادقین کا بھی وجود رہے گا۔

اب اس پر ابھی مزید تبصرہ کروں گا۔ یہ قرآن نے کہا، اس کا بھی تقاضا یہ کہ قیامت تک رہیں گے۔ رسولؐ نے فرمایا:

"اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ"۔

"میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں"۔

اللہ کی کتاب، دوسری میری عترت جو میرے اہل بیتؑ ہیں۔ متفق علیہ حدیث ہے:

"مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا"۔

"جب تک ان دونوں سے تمسک رکھو گے"۔

"لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ"۔

"میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہوگے"۔

"وَاِنَّهُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا"۔

"اور یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے"۔

اب مسلمانوں سے سوال ہے کہ اس وقت قرآن ہے، کون کہے گا کہ نہیں ہے۔ قرآن ہے۔ میں کہوں گا جو قرآن کے ساتھ تھے، ان میں سے کوئی ہے؟ اگر کہے نہیں ہے تو ہمارے آپ کے رسولؐ نے کہا تھا کہ رہے گا۔ انہوں نے کہا تھا کہ جدا نہیں ہوں گے۔ جدا ہو گئے۔ اور اب میں کوئی سخت جملہ کہنے کا عادی نہیں ہوں بس میں یہ کہتا ہوں کہ یہ رسولؐ وہ ہے جسے مشرک بھی صادق کہہ رہے تھے۔ اب مسلمان ہو کر آپ کو اختیار ہے کہ جو چاہے، کہئے۔ الحمدللہ پورا بیان ہوگا۔ یہ تو اپنے ہاتھ کی بات ہے۔ یہی موضوع پانچ دن میں بیان ہوسکتا تھا، یہی ایک دن میں بیان ہوگیا۔ اب میں کہتا ہوں کہ

قرآن نے بھی کہا کہ قیامت تک صادقین کا سلسلہ رہے گا۔ انہوں نے بھی کہا کہ کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ اگر کہے کہ نہیں ہیں تو جدا ہو گئے، رسولؐ کی سچائی ختم ہوگئی بلکہ قرآن کی صداقت ختم ہوگئی۔ اگر کہے کہ ہیں تو میں کہوں گا کہ آنکھ سے دکھائیے کہ کہاں ہیں؟ اگر آنکھ سے نہ دکھا سکے تو غائب مانتے۔

چونکہ ماشاء اللہ صاحبِ فہم ہیں، جو کچھ عرض کر رہا ہوں، آپ کے لئے جملے کافی ہیں، مختصر یہ کہ غیب وہ نہیں ہے۔ جو ہو ہی نہ، غیب وہ نہیں ہے جو آنکھوں کے سامنے ہو۔ غیب ایک ثبوت اور ایک نفی سے مل کر بنتا ہے۔ یعنی ہو اور آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ تو میں کہتا ہوں کہ ہونا تو سچے خدا اور رسولؐ، ان کے کہنے سے ثابت اور سامنے نہ ہونا آنکھوں سے ثابت۔

اب غیب کا کون جز ومحتاجِ ثبوت رہا؟ بس اب دنیا یہ کہتی ہے کہ اب غیب، ہاں خیر! غیب کو تو مانتے ہیں، بغیر غیب کو مانے تو یہ تو خدا کو مان سکتے ہیں۔ یہ سب باتیں بالکل ٹھیک ہیں مگر آدمی بشر اتنے دنوں تک زندہ رہے، یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ کسی کو ہم نے اتنے دن زندہ رہتے نہیں دیکھا۔ میں کہوں گا کہ دنیا میں بے شک کسی کو میں نے بھی زندہ رہتے نہیں دیکھا مگر مجھے دنیا سے کیا کام؟ جس سلسلہ کے بارے میں میری گفتگو ہے، اس میں سے کسی ایک کو مرتے نہیں دیکھا۔ کوئی ایک تو اپنی موت سے دنیا سے گیا ہوتا۔ میں نے ان میں سے کسی ایک کو بھی مرتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ خارجی حربے اپنا کام کرتے تھے۔ یا زہر یا تلوار۔ اب میرے الفاظ صاحبانِ علم محفوظ رکھ سکتے ہیں کہ میں

کہتا ہوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تقاضائے بقا ہر ایک کی ذات میں تھا، یہ مانع خارجی تھا جو اس مقتضی کو اثر کرنے سے روکتا تھا۔ بس جسے اللہ کو باقی رکھنا ہے، اس کے سلسلہ میں کوئی کام اسے نہیں کرنا۔ فقط حربوں کی زد سے الگ رکھنا ہے۔

اب دنیا کہتی ہے کہ غائب ہونے سے بڑی مصیبت ہوگئی۔ مصیبت نہ ہوتی تو ہم کیوں روتے؟ ہم کیوں بار بار فریادیں کرتے، استغاثے کرتے، عریضے کیوں بھیجتے؟ کوئی ہمیں پسند ہے غیبت؟ مگر کیا کریں جن کے باعث یہ غیبت ہوئی وہ کہہ رہے ہیں کہ کیوں غیبت ہوئی؟ میں کہتا ہوں کہ دنیا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر کیوں نہیں دیکھتی؟ گیارہ کے ساتھ کیا کیا؟ جو کہتے ہو کہ بارہواں کیوں غائب ہوا؟ میں تو دیکھتا ہوں کہ جیسے خالق اور مخلوق میں جنگ ہوگئی تھی، وہ کہہ رہا تھا کہ صادقین کے ساتھ رہو، یعنی قیامت تک سچے رہیں گے۔ دنیا والوں نے کہا کہ رہنے دینا تو ہمارا کام ہے۔ ہم رہنے ہی نہیں دیں گے تو کیونکر رہیں گے؟ اب جو الفاظ کہتا ہوں، انہیں محفوظ رکھئے۔ جب تک خزانہ حکمتِ باری میں صادقین کا ذخیرہ رہا، اس نے حربوں کو کام کرنے دیا، اچھا یہ نہیں، ابھی دوسرا ہمارے پاس ہے۔ چاہے کسی عمر کا ہو، اس سے مطلب نہیں کیونکہ صادقین میں عمر کو کوئی قید نہیں۔ یہ مباہلے ہی میں رسولؐ نے دیکھا دیا۔

اسے تم نے نہیں رہنے دیا؟ کوئی بات نہیں۔ ابھی ہے ہمارے

پاس ۔ اچھا ! اسے بھی نہیں رہنے دیا؟ اچھا نہ سہی ۔ اور ہے ۔ مگر اب جب مقصدِ الٰہی کا ایک فرد میں انحصار ہوگیا، اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا اور مخلوق کی جنگ ۔ اس کا آخری نتیجہ فتح وشکست کا ایک فرد کی بقاوفنا میں ہوگیا کہ اگر یہ رہتا ہے تو خدا کی بات پوری اور اگر یہ بھی ختم ہوجاتا ہے تو دنیا کامیاب اور اللہ ناکام (نعوذ باللہ) ۔

اب دنیا یہ بتائے کہ کیا قادر مطلق عاجز بندوں کے مقابلہ میں اپنی شکست مان لیتا؟ اب دنیا کو ختم کرنا ہوگا تو بھیج دے گا، یہ طے کر کے کہ یہ نہیں تو اب کچھ نہیں ۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا نے کربلا میں کوئی کمی اُٹھا رکھی تھی اس سلسلہ کو ختم کرنے کی؟ وہ تو خالق نے اپنے مقصد کے تحفظ کے لئے وہاں بھی غیبت سے کام لیا، ذرا باریک بات ہے مگر ماشاء اللہ آپ توجہ سے سن رہے ہیں ۔ وہاں بھی غیبت سے کام لیا ۔ غیبت کے معنی تو یہ ہیں کہ ہم انہیں دیکھ نہیں رہے ۔ اس نے غیبت یوں طاری کی کہ دن بھر انہیں غش میں رکھا کیونکہ اگر غش میں نہ ہوں تو باپؑ کی نصرت واجب ہوجائے ۔ اگر نصرت نہ کریں تو کردارِ امامت کے خلاف ہو ۔ پھر علی اکبرؑ سے ان کی منزل پیچھے رہ جائے ۔ امام کیسا جو اپنا فرض نہ ادا کرے ۔ ورنہ میرا ایمان ہے کہ ان حضرات کو غش بیہوش نہیں کرسکتا، مرض بیہوش نہیں کرسکتا ۔ یہ مشیتِ ربانی ہے، مصلحتِ کردگار ہے کہ دن بھر بیہوش رہے اور اس کا ثبوت میں بر بنائے واقعات عرض کروں گا کہ دن بھر بیہوش رہے ۔

مصائب

جب تک فریضہ جہاد ادا ہو رہا تھا، تب تک وہ بیہوش رہے ۔ اب یہ بیانِ مصائب ہے، بس اس پورے دن میں چند بار مجھے نظر آتا ہے کہ ہوش میں آئے ۔ پہلی منزل ہے وہ جب واضح غلامِ ترکی امام کی خدمت میں آیا کہ مجھے اجازت دیجئے، جیسے غلام ابوذر تھا، ویسے ہی یہ، ظاہر ہے کہ جَون بھی اپنے آپ کو غلامِ امام کہنے میں کوئی عذر نہیں رکھتے تھے مگر یہ اُن کی حق شناسی ہے کہ چالیس برس گزر گئے ابوذر کو لیکن اب بھی اُنہیں اپنا غلام نہیں کہتے، اُن کے نام کا جزو ہے، غلام ابوذر رہے، بس یہ اُن کو پناہ دیئے ہوئے ہیں اور اُن کی مدد کررہے ہیں ۔ اُن کی ضروریاتِ زندگی پوری کررہے ہیں اور نام اُن کا ہے غلام ابوذر ۔

اس طرح سے یہ ظاہر ہے کہ امام کے غلام تھے، امام حسین علیہ السلام کے، اس میں کیا شک مگر آپ نے ان کی نسبت دے دی تھی سید سجاد علیہ السلام کی طرف حضرت زین العابدین علیہ السلام کی طرف، تو یہ سید الساجدینؑ کے غلام تھے ۔ اب جب روزِ قربانی آیا اور مجاہدین راہِ خدا میں جان دینے لگے تو یہ بھی حاضر ہوئے اور خاندانِ رسالت میں رہ کر یہ غلام کیا ہوجاتے تھے، یہ تو حافظِ قرآن ہیں، میں نے تذکرۂ حفاظِ شیعہ میں، دو جلدوں میں ہے، اُن کا ذکر کیا ہے ''حافظِ قرآن'' امام کی خدمت میں حاضر ہوکر کہا: مولا! مجھے اجازت دیجئے کہ میں بھی جان دوں ۔ کہا: تم کو میں کیونکر اجازت دوں، تم تو زین العابدین

ؑ کے غلام ہو؟

یہ دیکھئے حفظِ حقوق ہے یعنی زین العابدین علیہ السلام سے اجازت لو، میں کیونکر اجازت دوں؟ لیجئے، آئے درِ خیمہ پر، کہلوایا کہ مجھے اپنے آقا سے کچھ عرض کرنا ہے۔ بیبیاں سمجھیں کہ کوئی خاص بات ہے، ورنہ اس محل پر جبکہ معلوم ہے کہ بیہوش ہیں، یہ حالت ناسازئ مزاج کی ہے تو کیوں آئے ہیں؟ کوئی اہم بات ہے، موقعہ دیا، آئے، کسی طرح سے ہوش میں لائے، حضرتؑ نے آنکھ کھول کر کہا: کیوں؟ کیسے آئے؟ کہا: حضور! بس اب مجھے اجازت دیجئے، میں چاہتا ہوں کہ آپ کے والد بزرگوار کی مدد کروں، نصرت کروں۔ امامؑ سے عرض کیا، وہ فرماتے ہیں کہ میں تمہیں نہیں اجازت دیتا، تم اجازت سیدِ سجادؑ سے لو، اس لئے حاضر ہوا ہوں۔

بس ایک عجیب کلمہ حضرتؑ نے فرمایا: اچھا! بابا پر یہ وقت پڑ گیا ہے کہ تمہاری مدد کی ضرورت ہے؟ اور اس کے بعد ایک عجیب کلمہ حسرت فرمایا: فرماتے ہیں کہ اگر ہم اس لائق ہوتے تو ہم اپنے بابا کی نصرت کرتے مگر ہم تو اس عالم میں ہیں، لہٰذا اے واضح! تم میری طرف سے جا کے میرے بابا کی مدد کرو، دیکھئے حسین نے سید سجاد علیہ السلام کے پاس بھیج کر مرتبہ ''واضح'' کو کس معراج پر پہنچا دیا!!

میں کہتا ہوں کہ جب خیمہ میں داخل ہوا تھا تو غلام تھا اور جب جا رہا ہے تو حقیقی معنی میں نائبِ امام ہو کر جا رہا ہے۔ اتنی ہی عزت افزائی بہت تھی مگر

بیبیوں سے کہا: ذرا گوشہ پردہ، گوشہ خیمہ ہٹا دیجئے، میں اپنے غلام کی نصرت دیکھوں، اپنے غلام کی جنگ دیکھ لوں۔ لیجئے! غلام نے پکارا، مولاؑ نے لاش اُٹھوائی میدان سے اور سید سجاد علیہ السلام کو غش آ گیا۔ وقت سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا ہے۔ اب میں بتاؤں کہ دوسری دفعہ کب غش سے افاقہ ہوا؟ جب مولاؑ نے کہا:

"هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنَا"

''کیا کوئی ہے جو میری مدد کرے؟''

حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نے کئی مرتبہ صدائے استغاثہ بلند کی اور ہر صدائے استغاثہ کا ایک اثر ہوا ہے، ایک صدائے استغاثہ پر علی اصغرؑ نے تڑپ کر خود کو جھولے سے گرا دیا تھا، ہر صدائے استغاثہ کا ایک خاص اثر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اثر امامؑ جانتے تھے کہ کیا ہو گا، اس لئے صدا ہے میدان میں اور نگاہ ہے درِ خیمہ پر۔ سید سجاد علیہ السلام کے کان میں آواز آئی، کہا: پھوپھی اماں! بابا آواز دے رہے ہیں؟ زینب نے اشک آلود آنکھوں سے کہا کہ ہاں، آواز تو تمہارے بابا ہی کی ہے تو عرض کیا: پھوپھی جان! ہم کس وقت کام آئیں گے، لایئے تلوار۔

❁❁❁❁❁